© rasailojaraid.com

کی طرف رُخ نہیں کرتا بلکہ اپنے ابنائے جنس کو بھی اس خطرے سے آگاہ رکھتا ہے۔ لیکن جس وقت یہ پھندے اپنے امتیازی رنگ کو زائل کر کے زمین سے پوری طرح یک رنگ ہو جاتے ہیں تو پھر شکار بڑی آسانی کے ساتھ اس دام میں اُلجھ جاتا ہے۔

قرآن مجید میں شیطان کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اسی حقیقت کی غمازی کرتے ہیں:

فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۔ (الاعراف آیت ۱۷)

بس تو جیسا تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا، آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔

"سیدھی راہ پر بیٹھ کر انسانوں کی گھات میں لگا رہنا" شیطان کا سب سے مؤثر اور کامیاب حربہ ہے۔ اگر وہ ٹیڑھی راہوں پر بیٹھ کر انسانوں کو گمراہ کرتا تو اس کے دامِ فریب میں صرف وہی لوگ آتے جو طبعاً گمراہی کو پسند کرتے۔ ایسے بدباطن انسانوں کی تعداد دنیا میں ہمیشہ بہت کم رہی ہے۔ انسان فطرتاً خیر اور بھلائی کا طلبگار ہوتا ہے اور جان بوجھ کر برائی کی راہ اختیار کرنے پر کم ہی آمادہ ہوتا ہے۔ اس لیے اُسے سب سے زیادہ فریب ہمیشہ نیکی، پرہیزگاری، اور فلاح و کامرانی کے نام پر دیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے حضرت آدم علیہ السّلام کے قصّے میں شیطان کی فریب کاریوں کا ذکر کرتے ہوئے انسان کی اس کمزوری کی طرف نہایت واضح الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ابوالبشر اور اُن کی زوجۂ محترمہ کو جنت میں رکھ کر انہیں شجرِ ممنوعہ کے قریب جانے کے متعلق تنبیہ فرمائی تو شیطان نے ان معصوم ہستیوں کو یہ کہہ کر بہکایا:

مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۔ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّىْ لَكُمَا لَمِنَ

تمہارے رب نے تمہیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ۔ یا تمہیں حیاتِ جاوید حاصل نہ ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

النّٰصِحِیۡنَ ۔ (الاعراف ۔ ۲۱) جائے اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔

یہ آیت اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے خیر اور بھلائی کا طالب ہے اور وہ اس معاملے میں اتنا حریص واقع ہوا ہے کہ کسی مقام پر بھی قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ اس میں ہر وقت اضافہ کا آرزو مند رہتا ہے۔ فرشتہ بننے کی خواہش یا حیاتِ جاوداں حاصل کرنے کی تمنا اپنے پیچھے بجز نیک مقصد کے اور کوئی محرک نہیں رکھتی۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ملائکہ کے زمرے میں داخل ہو کر وہ خیر اور بھلائی کے کسی بلند تر مقام پر فائز ہو سکے گا اور حیاتِ جاوداں اس کے دامن کو لاتعداد انعاماتِ خداوندی سے بھر دے گی۔

انسان کی یہ فطری خواہش ہی شیطان کا سب سے زبردست مورچہ ہے جس میں بیٹھ کر وہ نسلِ انسانی پر یلغار کرتا ہے۔ وہ اسے ورغلانے، صراطِ مستقیم سے ہٹانے اور گمراہی کی راہ پر ڈالنے کے لیے اُس کی اس خواہش سے اپیل کرتا ہے اور اس کا ناصح اور خیر خواہ بن کر اسے اپنے دام میں پھنساتا ہے۔

تاریخِ مذہب کے مطالعہ سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ مذہب میں جس قدر بگاڑ پیدا ہوا ہے اس کی ابتدا ہمیشہ مقدس آرزوؤں اور نیک تمناؤں سے ہوئی۔ ایک بالکل صحیح اور فطری خواہش جس کے پیچھے بجز خیر اور بھلائی کے اور کوئی جذبہ کارفرما نہ تھا، اُس نے ایک غلط رُخ اختیار کر کے مذہب کو اتنا شدید نقصان پہنچایا کہ وہ اس صدمے سے جانبر ہی نہ ہو سکا۔

اب ہم بگاڑ کی انہی مختلف صورتوں پر بحث کرتے ہیں:

بگاڑ کی سب سے پہلی، سب سے زیادہ نمایاں اور سب سے زیادہ خوفناک شکل انسان کے اُس فطری جذبہ سے شروع ہوئی جسے مذہب کی بنیاد اور اساس کہا جاتا ہے، یعنی لامحدود کا تصور اور اُس سے ہم آہنگ ہونے کا جذبہ۔ یہ جذبہ فطری طور پر جس چیز کا متقاضی ہے وہ یہ ہے کہ

دیکھے بھالے، بن سوجھے جانے پہچانے، بن بوجھے

وجود کا جو احساس انسان کے نفس میں موجود ہے، اس کی پوری معرفت حاصل کر کے اس کے منشا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرضی کے ساتھ اپنے ارادے کو ہم آہنگ کر دیا جائے۔ یہی حاسّۂ مذہبی کی تسکین کی معقول اور فطری صورت ہے۔

انسان محدود ہے اور ذاتِ مطلق لامحدود۔ اس بنا پر ان دونوں کے مابین ہم آہنگی کی یہ شکل بنیادی طور پر ناقابلِ تصور ہے کہ محدود انسان کسی منزل پر بھی لامحدود کا حصہ بن جائے۔ اس کی معراجِ کمال صرف اسی قدر ہے کہ وہ اپنے عزم اور ارادہ کو، اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو، اپنی پسند اور ناپسند کے معیار کو خالقِ مطلق کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کے ساتھ اس جذب و شوق سے مطابق کر دے کہ اس کی پابندی کرتے ہوئے کوئی دقت پیش نہ آئے۔ پھر اُس کے ذہن میں ہر وقت اور ہر آن یہ احساس پوری شدّت کے ساتھ موجود رہے کہ کوئی علیم و خبیر ذات جو اپنا ایک ارادہ اور منشا رکھتی ہے وہ ہمارے ہر عمل کو دیکھ کر اپنے دیئے ہوتے ضابطۂ حیات کے مطابق اس کی قدر و قیمت بھی متعین کر رہی ہے۔

اس کے علاوہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہم آہنگی کا فطری احساس ایک اور جائز شکل یہ بھی اختیار کرتا ہے کہ انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ سمجھے کہ جس قادرِ مطلق کے قانون کا پورا نظامِ تکوینی اور خود انسان کا وجود غیر اختیاری حصوں میں پابند ہے وہی ذات اس بات کا حق رکھتی ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اختیاری گوشوں میں بھی اُس کی پابندی کرے تاکہ اُس کی حیات کے درمیان تناقض دُور ہو اور وہ پُوری کی پُوری اللہ تعالیٰ کے نظامِ کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔

ہم آہنگی کی یہی تین جائز اور فطری صورتیں ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ ذاتِ مطلق کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے اسی فطری جذبہ نے جب غلط صورت اختیار کی تو مذہب میں کس نوعیت کا بگاڑ رونما ہوا۔ انسان کے اس فطری احساس نے جب اپنے جائز حدود سے تجاوز کر کے ذاتِ مطلق میں ادغام کو اپنا مقصود و مطلوب ٹھہرایا تو اس کی زد سب سے پہلے خود اُس ذات پر پڑی جس کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی اس میں خواہش موجود ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر وہ عابد و معبود کے درمیان کسی جوہری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اساسی فرق کا قائل ہو تو پھر یہ ادغام کی آرزو سرے سے غلط ہے۔ انسان اس کے متعلق اسی وقت سوچ سکتا ہے جب وہ اس غلط مفروضے کو ذہن میں بٹھا کر آگے بڑھے کہ اُس کی حیثیت گو ذاتِ مطلق کے مقابلے میں محض ایک حقیر قطرہ کی ہے لیکن اس بحرِ بیکراں کے ساتھ اس کا کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔ وہ حقیر ہونے کے باوجود بہر حال ہے اُسی کا ایک حصّہ جسے مادّی زندگی کے بندھنوں نے وقتی طور پر اُس سے جُدا کر رکھا ہے اور اُن کے ٹوٹتے ہی وہ اُسی وسیع و عریض سمندر میں جا ملے گا جس سے وہ کبھی الگ ہوا تھا۔

آپ اس باطل تصوّر کے مضمرات پر اگر غور کریں تو معلوم ہو گا اس سے مذہب کا پورا حلیہ بگڑ کر رہ جاتا ہے۔

انسان جب اپنے دل میں اس باطل خیال کو راسخ کر لیتا ہے کہ وہ لامحدود کا ہی ایک حصہ ہے تو اس کے اندر وہ احساسِ عبودیّت ختم ہو جاتا ہے جو مذہب کی جان ہے۔ اس کی ساری کوشش اُس کے دیئے ہوئے ضابطۂ اخلاق کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے بجائے ذاتِ حق میں مدغم ہونے پر صرف ہونے لگتی ہے۔ وہ پھر اپنی اس حیاتِ مستعار اور اُس کے مادی تقاضوں سے نہ صرف منہ موڑ لیتا ہے بلکہ ان کا شدید ترین دشمن بن جاتا ہے۔ کیونکہ یہی مادی علائق اس کی نظر میں اُس کے مقصد کے حصول کی راہ میں حائل ہیں۔ چنانچہ اس طرزِ فکر نے صرف انسان کو اپنی ضابطہ اخلاق کی پابندیوں سے بے نیاز کیا بلکہ اُسے اپنی جان کا سب سے بڑا دشمن بنا دیا۔ اپنے جسم کی زیادہ سے زیادہ تعذیب اور اپنے جسمانی تقاضوں کی زیادہ سے زیادہ تکذیب مذہب کا مقصدِ اولیٰ قرار پایا۔ اُس دیوار کو منہدم کرنے کی کوشش کی جو اسے بحرِ بیکراں میں جا شامل ہونے سے روک رہی تھی۔ تاریخ کے اوراق پر ایک نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دنیا میں جب بھی کسی مذہب نے ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے فطری جذبہ کو غلط راہ پر ڈال کر اُس ذاتِ بے ہمتا میں مدغم ہونے کو حیاتِ انسانی کا منتہائے مقصود ٹھہرایا تو اس کے ساتھ ہی رہبانیت کا آغاز ہوا جس نے بالآخر تعذیبِ جسم کی خوفناک صورت اختیار کی۔ آپ کو اگر اس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تفصیل درکار ہو تو لیکی کی کتاب تاریخ اخلاق یورپ کا مطالعہ کیجیے:

جسم کو راستے کا سنگِ گراں سمجھ کر جب اُس سے تنفر اور دشمنی کا رجحان پیدا ہُوا تو انسان کے دل و دماغ میں معاشرتی ذمہ داریوں اور انسانی تعلقات کے خلاف بھی نفرت کا ایک عام جذبہ اُبھرا اور انسان یہ سمجھنے لگا کہ حقیقی مذہبی زندگی صرف بحرِ بیکراں میں ادغام کی آرزو ہے، باقی سب فریب ہے۔ اس لیے انسان کی فلاح کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ نہ صرف اپنے جسم کے مطالبات سے چھٹکارا حاصل کرے بلکہ معاشرتی ذمہ داریوں سے یکسر الگ ہو کر گیان دھیان کے ذریعہ اپنے جسم کو تحلیل کرنے کی کوشش کرے تاکہ وہ جلد از جلد اپنا گوہرِ مقصود پالے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اہلِ مذہب نے معاشرتی زندگی سے منہ موڑ کر جنگلوں اور ویرانوں کا رُخ کیا اور اپنے جسم کو بڑے ہولناک طریقوں سے عذاب دے کر اسے مضمحل اور کمزور بنانے کی سعی کی تاکہ "روح" اس کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنے اصل مقام کی طرف آزادی سے پرواز کر سکے۔ ان راہبانِ صحرا نے اپنے جسموں کو جو روح فرسا تکلیفات دیں ان کا اندازہ مندرجۂ ذیل اقتباسات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے:

"سینٹ جیروم ایک راہب کے کمالات کی ثنا خوانی کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ وہ ایسا مردِ مجاہد تھا کہ اُس نے ۳۰ برس تک صرف جو کی روٹی پر قناعت کی اور سوائے گدلے پانی کے اور کسی مشروب کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اسی طرح ایک دوسرا راہب میکاریس مسلسل چھ ماہ تک دلدل میں سوتا رہا اور اپنے جسم کو مچھروں اور مکھیوں کے کاٹنے کے لیے بالکل برہنہ رکھا۔ وہ جہاں جاتا بلا مقصد ایک من وزن اٹھائے رکھتا۔ اُس کا شاگرد اپنے استاد سے بھی بازی لے گیا۔ اس نے ایک من کے بجائے پونے دو من وزن اٹھانا اپنا معمول بنا لیا۔ اور وہ تین سال تک ایک خشک کنوئیں میں پڑا رہا۔ سینٹ صرف وہی غلّہ اپنے استعمال میں لانے کا عادی تھا جو ایک ماہ تک پانی میں رہنے کی وجہ سے گل سڑ چکا ہو۔ سینٹ بسیرین نے چالیس روز خار دار جھاڑیوں میں بسر کیے اور چالیس برس تک سونے کے لیے بستر کے استعمال کو ممنوع سمجھا۔ ۔ ۔ ۔ ایک معروف راہب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جان تین برس تک مسلسل صرف ایک چٹان کا سہارا لیکر عبادت میں کھڑا رہا۔
ان میں سے بعض راہب ایسے بھی تھے جو جان بوجھ کر شیروں اور اسی قسم کے دوسرے خوفناک درندوں کے بھٹ میں رہتے۔ انہیں لباس سے شدید نفرت ہوتی اور جانوروں کی طرح ہاتھوں کے بل چلتے۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ جسم کی صفائی اور نفاست روح کو کثیف بنا دیتی ہے اور اس بنا پر مذہبی حلقوں میں صرف ایسے "خدا ترس" افراد کو ہی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا جو موت سے پہلے مٹی میں مل کر خاک ہو چکے ہوں[1]۔"

معاشرتی تعلقات اور انسانی برادری کی ذمہ داریوں سے جس طرح یہ عاشقان ربانی گریزاں تھے اُس کے متعلق بھی فاضل مصنف کی تصریحات قابلِ غور ہیں۔ جسم کے خلاف معاندانہ طرز فکر نے خون کے سارے رشتوں کی تکریم کو بالکل ختم کر کے رکھ دیا۔ راہبوں کے دلوں سے انسانی اخوت کے سارے احساسات مٹ گئے تھے اور وہ جس طرح اپنی جان کے دشمن تھے اُسی طرح اپنے ابنائے جنس کو بھی اس کرۂ ارضی پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ سمجھ کر ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس طرح ان راہبوں نے والدین، اولاد، بیوی، بہن، بھائی اور اسی طرح کے سارے رشتوں کو یکسر منقطع کر کے رکھ دیا۔ لیکی اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"خدا ترس لوگوں کے پیشِ نظر سارے دنیوی علائق کو توڑ کر صرف اپنی روح کے لیے نجات کا سامان فراہم کرنا تھا۔ ایوگریس کو مدتِ دراز کے بعد اپنی والدہ اور والد کے خطوط ملے لیکن خدا کے ساتھ اُس کے تعلقِ خاطر کو یہ بات بھی گوارا نہ تھی کہ اُس کا ذہن ایک لمحہ کے لیے اُس سے غافل ہو کر ان خطوط کی طرف متوجہ ہو۔ اس لیے اُس نے انہیں پڑھے بغیر اٹھا کر آگ میں پھینک دیا۔ ایک شخص میوٹس راہب بننے کی غرض سے ایک ناسک کے پاس آیا۔ اس کے ساتھ اُس کا چھوٹا بچہ بھی تھا۔ قربِ الٰہی کے

---

[1] W.E.H.LEEKI : HISTORY OF EUROPEAN MORALS VOL II P. 107–112

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حصول کے لیے یہ ضروری تھا کہ اُس کے دل و دماغ سے اپنے لختِ جگر کی محبت کا نقش پُوری طرح مٹا یا جاتا ۔ چنانچہ اُس کی روحانی تربیت کا یوُں آغاز ہُوا کہ بچّے کو باپ سے جُدا کر کے اُسے چیتھڑے پہنائے گئے اور اس کے بعد اُسے ناقابلِ بیان مظالم کا تختۂ مشق بنایا گیا ۔ بچہ ہر روز باپ کے سامنے لایا جاتا اور وہ اپنی آنکھوں کے سامنے پھول سے تر و تازہ چہرے کو کملاتے ہوتے دیکھتا لیکن وہ یسوع مسیح کی محبت میں اتنا غرق تھا کہ اُسے اپنے اس بچّے کی حالت زار قطعاً متاثر نہ کرتی ۔ اُسے صرف اپنے درجات کی بلندی مطلوب تھی ۔ اُسی اثنا میں اُسے ایک دن یہ حکم ملا کہ وہ اپنے جگر کے اس ٹکڑے کو دریا بُرد کر دے ۔ وہ بغیر کسی تامّل کے اس ارشاد کی تعمیل کے لیے آگے بڑھا

اسی طرح ایک "خدا پرست" نے اپنے تین بچوں کو چھوڑ کر معبود کی تلاش میں کسی جنگل کا رُخ کیا ۔ تین سال کے بعد اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہُوا کہ جس نیک مقصد میں وہ اپنی عمر عزیز کھپا رہا ہے اُس کی اولاد کو بھی اسی کے لیے تیار ہونا چاہیے ۔ چنانچہ وہ بچّوں کو اپنے ساتھ لانے کے لیے گھر گیا ۔ وہاں جا کر اُسے معلوم ہُوا کہ اُس کے دونوں بڑے لڑکے فوت ہو چکے ہیں ۔ وہ تیسرے بچّے کو گود میں لے کر پادری کی بارگاہ میں حاضر ہُوا ۔ پادری نے اُس سے دریافت کیا کہ کیا وہ اپنے دل میں اس بچّے کے لیے کوئی جذبۂ محبت و شفقت رکھتا ہے ۔ باپ نے جواب دیا : ہاں ۔ اس پر پادری نے کہا کہ جس دل میں اولاد کی محبت ہو اس میں محبتِ الٰہی نہیں سما سکتی اس لیے یہ ضروری ہے کہ تم بچّے کو لے جاؤ اور اُسے دہکتے الاؤ میں پھینک دو[1]"

قربِ الٰہی کے ان آرزومندوں کو یوُں تو اپنے سارے قرابت داروں بلکہ پوُری نوعِ انسانی سے شدید نفرت تھی ، لیکن عورت کے متعلق ان کے جذبات میں جتنی غیر معمولی شدت تھی اُس کا اندازہ مندرجۂ ذیل واقعات سے لگایا جا سکتا ہے :

---

[1] لیکی : تاریخِ اخلاقِ یورپ ص ۱۲۶ - ۱۲۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"سینٹ پومین اور اُس کے چھ بھائیوں نے اپنی بوڑھی ماں سے قطع تعلق کر کے اللہ کے ساتھ رشتۂ عبودیت قائم کرنے کے لیے مصر کے صحرا میں راہبانہ زندگی کا آغاز کیا۔ ماں کے لیے یہ جدائی ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ بچاری مامتا کی ماری اُن کی تلاش میں روانہ ہوئی۔ اُس نے بڑی تکلیفات اور مشقتیں اٹھا کر اُن کی خانقاہ کو تلاش کیا لیکن یہ اولاد چونکہ ماں کی محبت اور اُس کی ملاقات کو محبتِ الٰہی اور اُس کے قرب کی راہ میں حائل سمجھتی تھی، اس لیے انھوں نے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ بوڑھی مظلوم اور بے بس عورت کئی دنوں تک وہاں اُن کے دیدار کے لیے ترستی رہی۔ ایک دن اُس کے لختِ جگر جب خانقاہ سے نکل کر کلیسا کی طرف جا رہے تھے، تو اچانک اُس کی نگاہ اُن پر پڑ گئی۔ مگر یہ بات حق کے پرستاروں کو کب گوارا تھی۔ وہ راستے ہی سے واپس پلٹ آئے اور خانقاہ کے اندر داخل ہو کر اُس کا دروازہ مقفل کر لیا۔ وہ بچاری انتہائی اضطراب کی حالت میں اُن کی منت سماجت کرتی کہ وہ صرف ایک مرتبہ اس کے سامنے ہی آ جائیں۔ مگر وہ بالکل نہ مانے اور اس سے بڑے تند و تیز لہجے میں مخاطب ہو کر کہا: وہ انھیں کیوں ستا رہی ہے۔ اُس غریب بڑھیا کے کانوں میں جب اپنے بچوں کی جانی پہچانی آواز پڑی تو اُس کا دل بھر آیا اور اس نے شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر روتے ہوئے کہا: "میں تمھیں اس لیے ستا رہی ہوں کہ میں اپنے جگر پاروں کے دیدار کے لیے بیتاب ہوں۔ تم میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو، آخر بتاؤ تو سہی کہ اگر میں تمہارے چہروں پر ایک نگاہ ڈال کر اپنے کلیجے کو ٹھنڈا کر سکوں تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا۔ کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں، کیا میں نے تمہیں دودھ نہیں پلایا۔ خدارا میری حالتِ زار پر رحم کھاؤ۔ میں تمہاری جدائی کی تاب نہیں لا سکتی۔"

بوڑھی مامتا کا نالہ و شیون اللہ کی محبت میں سرشار فرزندوں کے احساس مردہ کو جگانے میں یکسر ناکام رہا اور وہ ماں کی آہ و زاری کے جواب میں صرف یہ کہہ کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاموش ہو گئے کہ وہ اب اپنے اصل مقصود یعنی اللہ سے وصل کے حصول کے بعد ہی اس کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے موت سے پہلے اُسے اپنے بیٹوں کا دیدار نصیب نہیں ہو سکتا[1]۔"

اسی طرح ایک اور راہب سینٹ سائمن شائلائٹ جو اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا انہیں بُری کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ کر کسی خانقاہ میں "روحانی تربیت" کی غرض سے داخل ہوا۔ اس کا باپ شدتِ غم کی تاب نہ لا کر جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ماں ستائیس سال تک اس کی راہ تکتی رہی۔ آخر ایک دن وہ اس کے پاس خانقاہ میں پہنچ گئی اور اسے دیکھنے کی آرزو کی لیکن خدا کے اس پرستار نے ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی طرف التفات نہ کیا۔ اس نے بڑی منت سماجت کی۔ اُسے اپنی ممتا کا واسطہ دیا۔ بالآخر خدا کے اس پاکباز فدائی نے اُسے صرف اتنا پیغام دیا کہ وہ عنقریب اُس سے ملے گا۔ وہ تین دن اور تین راتیں بغیر کچھ کھائے پئے برابر اس کی ملاقات کی منتظر رہی۔ آخر اس کا نحیف اور کمزور جسم اس شدید بھوک اور تھکان کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے عاشقانِ الٰہی کے عین مسکن کے سامنے، بیٹے کے فراق میں دم توڑ دیا۔ اس کا فرزندِ ارجمند جس کے دل کے سوتوں کو محبتِ الٰہی کے استغراق نے دنیوی محبت کے لیے بالکل خشک کر دیا تھا، خانقاہ سے اپنے ساتھیوں سمیت باہر آیا۔ ماں کی لاش پر کھڑے ہو کر دعا کی اور پھر واپس جا کر گیان دھیان میں مصروف ہو گیا۔

قربِ الٰہی کے متعلق اس غلط نظریہ نے انسانوں کے اندر انسانی محبت و اخوت، انسانی بھائی چارہ اور خاندانی اور قومی تعلقات کو بالکل برباد کر کے رکھ دیا۔ اس سے تہذیب و تمدن، معاشرت و معیشت، سیاست و اجتماعیت کی جڑیں ہل گئیں۔ انسان نے اپنے سارے انسانی حقوق و فرائض سے منہ موڑ کر صرف اپنی روحانی تربیت کی فکر کی اور وہ روحانی تربیت بھی ایسی نہ تھی جس سے اُس کے اندر اپنی انسانی ذمہ داریوں کا احساس بیدار ہوتا بلکہ اس کی غرض صرف

---

[1] لیکی: تاریخ اخلاق یورپ صفحہ ۱۴۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ تھی کہ وہ اپنے مادی وجود کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا کر اسے اتنا مضمحل اور کمزور کر دے کہ خدا اور بندے کے درمیان جسم کی جو فصیل حائل ہے وہ ٹوٹ کر روح کو بحرِ بیکراں سے ہم آغوش ہونے کے لیے آزاد کر سکے۔

اس طرزِ فکر کے مطابق انسان کا مقصد چونکہ لامحدود میں فنا ہونا ہے اس لیے اس کے علمبردار اپنی ذات اور اپنے وجود کو غیر مؤثر بنانے کے لیے عجیب و غریب طریقے اختیار کرتے ہیں۔ شعورِ ذات سے انسان کی انفرادیت قائم ہے۔ چونکہ یہ پاکباز اپنے وجود کے دشمن تھے اس لیے ان کا سارا زور اس بات پر صرف ہوتا کہ کسی طرح شعور کو مفلوج کیا جائے۔ اس غرض کے لیے کئی قسم کی تدابیر پر عملدرآمد کیا جاتا۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی علم سے دشمنی اور پرخاش تھی۔ علم سے انسان کے اندر جہاں ذاتِ الٰہی کا عرفان پیدا ہوتا ہے وہاں اُس کے اندر اپنی ذات کا شعور بھی بیدار ہوتا ہے چنانچہ دیکھیے کہ جن حضرات نے فنا فی اللہ کے معنی لامحدود میں اپنی ذات کو یکسر گم کرنے کے سمجھے انہوں نے علم کو مذہب کا سب سے بڑا دشمن خیال کیا۔ پھر شعور کو مغلوب کرنے کے لیے سماع کی محفلیں سجائی جانے لگیں اور وجد و حال کے مختلف حلقے قائم ہوئے تاکہ خدا پرستوں پر حالتِ سکر طاری کی جا سکے۔ مذہب کا مقصد سوائے روحانی کیف و مستی کے اور کچھ نہ رہا۔ انسان ہمیشہ پُراسرار کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ ان حضرات کے نزدیک مذہب کا ماحصل کیا تھا، اس کا اندازہ ایک مذہب پرست کی اس قلبی واردات سے لگایا جا سکتا ہے:

"مجھے آج تک وہ رات، بلکہ پہاڑی پر وہ جگہ اچھی طرح یاد ہے جبکہ میری روح لامحدود میں گم ہو گئی تھی اور دونوں عالم یعنی عالمِ خارجی اور عالمِ باطنی دونوں ایک دوسرے میں مل گئے تھے، جیسے کہ ایک گہرا سمندر، دوسرے گہرے سمندر کو پکار رہا ہو۔ میری روح ذاتِ مطلق میں پوری طرح گم تھی۔ مجھے خارجی دنیا کا کوئی احساس تک باقی نہ رہا تھا۔ مجھ پر ایک ناقابلِ بیان کیف و مستی کا عالم طاری تھا اور مجھے چند لمحوں کے لیے یہ محسوس ہوا کہ میں، کائنات اور خالقِ کائنات ایک دوسرے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ اسی طرح ہم آہنگ ہیں جس طرح کہ کسی راگ کی مختلف دھنیں ایک نغمہ میں شامل ہو کر اپنی انفرادیت کھو دیتی ہیں[۱]

یہ روحانی کیف و مستی خواہ کتنی ہی قابلِ قدر ہو مگر اس کا یہ نتیجہ ضرور برآمد ہوا کہ انسانوں کے اندر نہ صرف احساسِ ذمہ داری ختم ہوا بلکہ انہوں نے خود فراموشی کو روحانی ترقی کا ایک زینہ قرار دیا۔

ایک انسان اپنے آپ پر کیف و مستی کی یہ حالت جتنی شدت کے ساتھ طاری کرتا اُسی نسبت سے وہ مقدس اور خدا پرست تسلیم کیا جانے لگا۔ جب اخلاق اور مذہب کے علمبرداروں نے دنیا کی زمامِ کار کو سنبھالنے سے خود ہی انکار کر دیا اور امورِ دنیا کو ناپاک اور حقیر سمجھ کر اُن سے یکسر بے تعلقی پیدا کر لی تو معاشرت، معیشت اور سیاست کی باگ ڈور خود بخود اُن عیار اور چالاک لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو خالص دنیا دار تھے اور جن کے اندر خدا ترسی کا کوئی شائبہ بھی نہ تھا۔ نفس کے ان بندوں کو اپنی من مانی کارروائیوں کے لیے بڑا کھلا اور وسیع میدان ملا اور انہوں نے بڑی آزادی کے ساتھ اپنے دل کے ارمان نکالنے شروع کیے اور اس طرح مذہب جو ہمیشہ سے بے کسوں اور ستم زدوں کا سب سے بڑا سہارا سمجھا جاتا تھا وہ "عاشقانِ الٰہی" کی غفلت کی وجہ سے اپنی افادیت کھو بیٹھا۔ لامحدود کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے غلط تصور نے اُس مقصد کو ہی تباہ کر دیا جس کے حصول کے لیے انسان مذہب کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

انسان جب تک اپنے وجود کا اثبات نہیں کرتا، اُس کے اندر جس وقت تک اس بات کا پختہ یقین پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ذاتِ مطلق کے مقابلے میں اپنی الگ انفرادیت رکھتا ہے، اس وقت تک وہ کسی روحانی اور اخلاقی ضابطۂ حیات کا پابند نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے منشا اور ارادہ کو کسی بالاتر ذات کے ارادے کے تابع صرف اسی صورت میں کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے جب اُس کے اندر یہ احساس پوری طرح موجود ہو کہ اس کی ذات سے الگ ایک ایسی اعلیٰ

---

[۱] VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE P. 144 BY WILLIAM JAMES

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ارفع ذات موجود ہے جو اُس کی معبود ہے اور جس کی مرضی کے ساتھ خود کو مطابق کر کے ہی وہ فلاح وکامرانی حاصل کر سکتا ہے۔ یہی وہ احساس ہے جو اُسے ایک مقصد کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل کرتا ہے اور اُسے اس بات کا شعور بخشتا ہے کہ اُسے اس گوہرِ مقصود کو اپنی جد وجہد سے حاصل کرنا ہے۔

مذہب کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ جن حضرات نے فنا فی اللہ کا مقصد اپنے ارادے کو بالاتر ذات کے ارادے کے تابع کرنے کے بجائے اپنی ہستی کو اس کی ذات میں گم کرنا قرار دیا وہ جبریت کے قائل رہے اور انہوں نے ان پابندیوں سے گریز کیا جو مذہب انسان پر عائد کرتا ہے۔ انہوں نے یہ مفروضہ قائم کیا کہ جس طرح قطرہ اپنے جیسے دوسرے قطرات کے ساتھ مل کر اپنے ارادے سے نہیں بلکہ قانونِ تکوینی کے تحت ندی نالوں میں سے گزرتا ہوا خود بخود بحرِ بیکراں کے ساتھ مل جاتا ہے بالکل اسی طرح انسان بھی اضطراری طور پر اپنے منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہے اور اس کا ہر قدم اُسے بحرِ بیکراں سے قریب کر رہا ہے۔

پھر انسان جب کشف و تجلیات اور روحانی کیف و مستی اور خود فراموشی کو اپنی زندگی کا مطلوب و مقصود ٹھہرا لے تو وہ فطری طور پر اپنے آپ کو ہر قسم کی خارجی پابندیوں سے آزاد کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کا اپنا من اور اس کا باطن ہی اس کے صحیح اور برحق ہونے کی سب سے بڑی شہادت فراہم کرتے ہیں۔ اُس کے نزدیک شرعی ضابطے محض بیکار کی زنجیریں بن جاتی ہیں جن سے وہ نجات حاصل کرنے کے لیے بیتاب رہتا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں شریعت و طریقت اور ظاہر و باطن کی جس آویزش یا اربابِ حال و اربابِ قال کے درمیان جس بعد اور بیگانگی بلکہ جس کشمکش اور سر پھٹول کا ذکر ملتا ہے وہ صرف مسلم قوم کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ دنیا کے سارے مذاہب میں اس آویزش کی داستانیں بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ خود عیسائیوں کے ہاں یہ مسئلہ صدیوں تک زیرِ بحث رہا۔ تاریخ کے ہر دور میں یہ سوال ذہنوں میں اضطراب پیدا کرتا رہا کہ اہلِ حال اور اہلِ قال کے درمیان کس طرح مصالحت پیدا کی جائے۔ جب ایک شخص مذہب کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقصود صرف روحانی کیف و مستی کو ٹھہراتا ہے تو وہ لازمی طور پر انہیں تدابیر کو صحیح اور برحق سمجھتا ہے جن سے اُسے یہ "مقامِ محمود" حاصل ہو اور اس طرح وہ اُن سارے ضابطوں سے بغاوت کرتا ہے جنہیں وہ اس مقصد کے لیے مفید اور کارآمد نہیں سمجھتا۔ دوسری طرف وہ جب کسی شریعت کو الہامی ضابطۂ حیات مان کر اُس کی پابندی کا عزم کرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس ضابطۂ حیات میں جہاں انسان اور اُس کے خالق و مالک کے درمیان صحیح تعلق کی نوعیت کی وضاحت کی گئی ہے وہاں انسان اور انسان کے درمیان تعلقات کے لیے بھی بعض واضح ہدایات بھی موجود ہیں۔ اب وہ اگر مذہب کو ضابطۂ حیات کے طور پر اپناتا ہے تو اُسے اپنے جسم کے تقاضوں اور اپنی خاندانی معاشرتی اور انسانی ذمہ داریوں کو بھی برابر نگاہ میں رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ ذمہ داریاں "خالص خداپرستوں" کے لیے ناقابلِ برداشت ہیں، کیونکہ ان کی پرچھائیں ان کے باطن پر اثر انداز ہو کر انہیں خدا سے غافل کر دیتی ہے۔ آپ کو اگر اس اُلجھن کی تفصیلات کا اندازہ کرنا مقصود ہو تو فلسفۂ مذہب کے مشہور شارح فیڈرک ہیلر کی کتاب "عبادت" کا مطالعہ کریں، خصوصاً اس کا وہ باب جس میں اُس نے متصوفانہ مذہب اور پیغمبرانہ مذہب کے خدوخال واضح کیے ہیں۔

خداپرستوں کے سامنے ہمیشہ یہ پیچیدگی رہی ہے کہ وہ مذہب کی ظاہری پابندیوں کو قبول کر کے خدا کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کو اپنائیں یا اپنے باطن کی صفائی پر پوری توجہ صرف کر کے، اپنی روح کو اتنا لطیف بنا دیں کہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ لامحدود میں گم ہو سکے۔ اس پیچیدگی کو جس انداز سے حل کیا گیا اُس سے بھی مذہب کے اندر غیر معمولی بگاڑ پیدا ہوا۔ مذہب کے علمبرداروں نے انسانی زندگی کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصّہ مذہبی اور روحانی زندگی کا جس میں انسان صرف اپنے باطن کی صفائی کے لیے ریاضت کرے اور دوسرا حصّہ معاشرتی اور سیاسی زندگی کا جس کے تحت وہ اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو۔ مذہب کے ان بہی خواہوں نے صرف مشاہدۂ حق کو مذہب کا اصل مقصود قرار دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کا دائرہ صرف گیان، دھیان یا چند مذہبی رسومات تک سمٹ کر رہ گیا اور انسان کی اجتماعی

(باقی ص ۲۵ پر)
© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رُویتِ ہلال

(جنابِ حسن احمد مینائی صاحب)

رویتِ ہلال کے بارے میں اِن دنوں جو اُلجھنیں ہیں اور خصوصاً بعض اسلامی ممالک میں جس طرح قمری مہینوں کے آغاز کا اعلان کیا جا رہا ہے اس ضمن میں بعض امور انتہائی سنجیدگی کے ساتھ غور طلب ہیں جو بنیادی مذہبی اہمیت رکھتے ہیں۔ ۱۳۸۵ھ کی عید الفطر کے موقع پر پاکستان میں جو انتشار رہا اُس کے پیشِ نظر یہ مسئلہ اور زیادہ قابلِ توجہ ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ استدلال درست نہیں ہے کہ بعض اسلامی ملکوں میں قمری مہینے، پاکستان کے مقابلے میں عموماً دو دن پہلے شروع ہو رہے ہیں اور شوال ۱۳۸۵ھ کی تاریخوں میں تین دن کا تفاوت ہو گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی غلط عمل کو، خواہ وہ کسی کی جانب سے ہو، استدلال کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ گزشتہ کچھ عرصے سے بعض ملکوں میں قمری مہینوں کے آغاز کا اعلان ایسے دن کر دیا جاتا ہے جبکہ نئے چاند کا نظر آنا ممکن ہی نہیں۔ بہ الفاظِ دیگر چاند اس منزل اور درجے پر پہنچتا ہی نہیں جب وہ ہلال کی شکل میں دکھائی دے سکے۔ اس کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت چودھویں رات کے چاند سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس رات ماہِ کامل ہو وہ ظاہر ہے کہ ہلال کی رویت کے بعد سے چودھویں شب ہو گی۔ لیکن اگر اُس حساب کو دُرست فرض کیا جائے جو بعض جگہ چلایا جا رہا ہے تو سب ہی دیکھ سکتے ہیں کہ ماہِ کامل کی شب عموماً سولھویں شب قرار پاتی ہے جو بدیہی طور پر ناقابلِ قبول ہے۔ اِسی چیز کو یُوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُن ملکوں میں جہاں قمری مہینے رویتِ ہلال سے قبل شروع کیے جا رہے ہیں وہاں مقامی حساب کے مطابق چودھویں رات کو ماہِ کامل نہیں ہو گا جیسے سب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ کسی طرح بھی باور نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے ہاں عموماً بارھویں رات کا جو غیر کامل چاند ہو گا وہ اسی رات کو، وقت کے تھوڑے سے فرق کی وجہ سے اُن علاقوں میں ماہِ کامل نظر آ رہا ہو گا

© rasailojaraid.com